قرآن میں اصحابِ فیل کا واقعہ

جناب محمد رفیق چودھری صاحب - ادارۂ معارف اسلامی منصورہ لاہور

(۲)

بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ کے معنی متجددین حضرات نے اس سورہ کے الفاظ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ پر تدبر نہیں کیا اور نہ ہی ان الفاظ کو قرآن مجید کے دوسرے نظائر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اگر صرف انہی دو الفاظ پر تھوڑا سا غور و تدبر فرما لیتے تو ان کے ذہن میں کبھی وہ نرالی تاویل پیدا نہ ہوتی جسے وہ بیان کیا کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں حِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ کے الفاظ اسی صورت میں صرف دو بار آئے ہیں۔ اور دونوں مرتبہ ان سے مراد "عذابِ الٰہی کے پتھر" ہیں، نہ کہ انسانوں (یا قریش) کے پھینکے ہوئے پتھر۔

پہلی مرتبہ یہ الفاظ سورۂ ہود کی آیت ۸۲ میں اس طرح وارد ہوئے ہیں:

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ	پھر جب ہمارا حکم آن پہنچا تو ہم نے اس (بستی) کے بلند کو اس کا پست بنا دیا اور ہم نے وہاں کنکر برسا دیئے۔

یہ قومِ لوطؑ پر عذابِ الٰہی کی کیفیت کا بیان ہے۔ اور اس میں حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ

کے الفاظ صریحاً اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے عذاب کے پتھروں پر دال ہیں۔ انسانوں کے پھینکے ہوئے پتھر یہاں کسی صورت مراد نہیں لیے جا سکتے۔ آیتِ مذکورہ میں جن پتھروں کا ذکر ہے۔ اُن سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ آسمانی پتھر ہیں جو قومِ لوطؑ پر ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے برسائے گئے تھے۔

دوسری مرتبہ یہی الفاظ سورۂ الحجر کی آیت ۷۴ میں آئے ہیں:

فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ	پھر ہم نے اُس بستی کو زیروزبر
اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً	کر دیا اور ان لوگوں پر کھنگر کے پتھر
مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝	برسا دیئے۔

اس جگہ پر بھی حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ کے الفاظ انسانوں کے پھینکے ہوئے پتھروں کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی صورت میں برسائے گئے پتھروں کے لیے استعمال ہوئے ہیں کہ جن کے ذریعے قومِ لوطؑ کو تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔

بالکل یہی الفاظ جب سورۂ فیل میں آئے ہیں تو ہم کیوں نہ اُن سے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابرہہ کے لشکر پر عذاب کی صورت میں برسائے گئے پتھر ہی مُراد نہ لیں؟ کیوں ان الفاظ کی دُور از کار تاویلیں کرنے لگیں اور اللہ کی کتاب کو سمجھنے کے لیے خود ہی اپنی آنکھوں پر پٹیاں باندھ لیں اور اپنے دلوں پر قفل چڑھا لیں؟

حَاصِبٌ یعنی سخت آندھی

تجدد پسند حضرات سورۂ فیل کی تفسیر میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اصحابِ فیل کا لشکر تباہ کرنے میں دو عناصر کا بڑا ہاتھ ہے۔ ایک قریش کی طرف سے کنکریاں پھینکنا اور دوسرے اچانک سخت آندھی (حاصب) کا چل پڑنا۔ ان کی یہ تاویل بھی کئی لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔

اوّل یہ کہ سورۂ فیل میں حاصب یعنی سخت آندھی کے چلنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ صرف پرندوں کے جھنڈ بھیجے جانے کا ذکر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان میں سے کون سی تاویل اختیار کی جائے۔ وہ جسے قرآن بیان کرتا ہے یا وہ جسے قرآن بیان نہیں کرتا۔ قرآن کی تفسیر میں اُس کے اپنے مذکورہ الفاظ معاون ثابت ہو سکتے ہیں یا پھر وہ چیزیں جن کو کسی انسان کا

تخیل خود تراش لینا ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ اصحاب فیل کے واقعے میں حاصب (سخت آندھی) کے چلنے کا عنصر شامل کرنا ایک من گھڑت افسانے سے زیادہ نہیں ہے۔

ب- دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اگر یہ ممکن ہے کہ وہ بے جان ہوا میں اتنی قوت پیدا کر دے کہ اس کے ذریعے لشکر تباہ ہو جائیں تو کیا اللہ تعالیٰ سے یہ ناممکن ہے کہ وہ جاندار پرندوں کے پھینکے ہوئے سنگریزوں کے ذریعے کسی لشکر کو برباد نہ کر سکے۔ افسوس! اِن متجددین کی عقل پر جو ایک جگہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تسلیم کر لیتے ہیں، مگر دوسری جگہ اس کی عاجزی ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ افسوس! معجزات کو نہ ماننے کی ضد بھی انسان کی عقل کو کہاں لے جاتی ہے۔

نُصرتِ الٰہی کا قانون

متجددین حضرات کا کہنا ہے کہ اصحاب فیل کے واقعے کو بھی اللہ تعالیٰ کی اس سنّت کی روشنی میں سمجھنا چاہیے کہ افراد کی جدوجہد ہو گی تو اللہ تعالیٰ اُن کی مدد کرے گا۔ بندے اگر کوئی کوشش نہیں کریں گے تو اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید نہیں ہو گی۔

مگر متجددین یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنّتِ نصرت و تائید بندوں کی جدوجہد کے ساتھ ہر حال میں مشروط نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ایسے واقعات بکثرت ملتے ہیں اور تاریخ اسلام بھی اس پر شاہد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ اس کے عاجز بندے کسی بوجھ اور ذمہ داری کو اُٹھانے کی قدرت و استطاعت نہیں رکھتے تو وہ اپنا خاص فضل و کرم فرما کر اپنے بندوں پر کوئی ناقابلِ برداشت بوجھ نہیں ڈالتا۔ اس ضمن میں قرآن مجید کا یہ اصل الاصول ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ (البقرہ: ۲۸۶) اللہ کسی کو ذمہ دار نہیں بناتا، مگر اس کی بساط کے مطابق۔

گویا تکلیف مالا یطاق کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی سنّت یہی ہے کہ وہ بندوں کی سعی و کوشش کے بغیر ہی ان پر اپنا فیضانِ رحمت کرتا اور ان کو تائید و نصرت سے نوازتا ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السّلام کو جب آگ کے الاؤ میں ڈالا گیا تھا۔ اُس وقت آپ

نے وہ کون سی تدابیر اور جد و جہد کی تھی جس کے ذریعے وہ آتشِ نمرود سے اپنے آپ کو محفوظ کر سکتے تھے؟ اور خلیل اللہ کی وہ کونسی کوشش تھی جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اُس آتش کدے کو گلزار بنا دیا تھا؟

جب سیدنا یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے تھے تو اُن کی وہ کون سی عملی جد و جہد اور تدبیر تھی جس کے نتیجے میں اُن کو وہاں سے نجات بخشی گئی تھی؟ اور اللہ تعالیٰ کی سنّتِ تائید و نصرت حاصل ہوئی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اس کے لیے دُعا کی اور تسبیحات پڑھی تھی۔ تو یہ کوئی ایسی عملی جد و جہد اور کسب نہیں ہے جسے متجددین حضرات نصرتِ الٰہی کے قانون سے متعلق قرار دیں۔ تاہم اگر صرف دُعا و تسبیح یونس علیہ السلام کے لیے مچھلی کے پیٹ سے رہائی کا سبب بنی تھی تو یہی محرک اصحابِ فیل کے واقعہ میں بھی موجود ہے۔ صحیح واقعات کے مطابق عبد المطلب اور بعض دوسرے سردارانِ قریش نے بھی خانہ کعبہ کی چوکھٹ پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تھی کہ وہ اُن کو ابرہہ کے لشکر کے خطرے سے بچائے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی یہ دُعا قبول کی اور قریش کو اس آفت سے نجات دلائی۔

جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ سے ہجرت فرما کر مدینے جانے کا عزم کر رہے تھے اور ان کے گھر کا محاصرہ شمشیر بدست جوانوں نے کر رکھا تھا تو اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تحفظ کے لیے کون سی عملی جد و جہد اور تدبیر کی تھی جس کے نتیجے میں آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید حاصل ہوئی تھی۔ اور آپؐ دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر گھر سے بحفاظت نکل گئے تھے؟ اللہ تعالیٰ کی سنّتِ تائید و نصرت اس واقعے میں بھی انسانی جد و جہد کے ساتھ ہرگز مشروط نہ تھی۔

اور یہ تو انفرادی واقعات کی مثالیں تھیں، اجتماعی صورت میں اللہ تعالیٰ کی نصرت کا قانون صرف وہی نہیں جو متجددین نے سمجھ رکھا ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل مصر سے نکل کر فلسطین جا رہے تھے اور اُن کے سامنے بحیرۂ قلزم کی خوفناک لہریں تھیں اور پیچھے کی جانب فرعون اور اس کا لشکرِ جرار ان کے تعاقب میں قریب آن پہنچا تھا تو اُس وقت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل

نے وہ کون سی عملی تدبیر اور جد وجہد کی تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے سمندر کے اندر خشک راستے بنا دیئے تھے؟ اور دیکھتے ہی دیکھتے فرعون اور اُس کا سارا لشکر غرقاب ہو گیا تھا۔ کیا اس وقت اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت کارفرما تھی کہ اس کے کمزور اور ناتواں بندے ایک طرف سمندر کی موجوں اور دوسری طرف فرعون کی فوجوں کا مقابلہ کرنے کی تاب نہیں رکھتے اس لیے اُن کو اس سخت آزمائش کی ہولناکی اور خطرے سے بچا لیا جائے؟

متجددین حضرات اس واقعے کی جھٹ سے یہ تاویل کر دیتے ہیں کہ بحیرۂ قلزم کے مدّوجزر کی دو مختلف حالتوں کے پیش نظر موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل تو بسلامت پار اُتر گئے۔ لیکن اندھا فرعون اور اس کے اندھے لشکر کو اس صورتِ حال کا علم نہیں ہو سکا تھا اس لیے وہ مدّوجزر کی زد میں آکر غرقاب ہو گئے تھے۔ مگر یہ تاویل قرآن مجید کے صریح الفاظ اور نصوص کے اس قدر خلاف اور عقلی اعتبار سے اس قدر بھونڈی ہے کہ اس کی تردید کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اجماعِ اُمت کے خلاف

متجددین نے سورۂ فیل کی جو نئی اور من مانی تاویل کی ہے وہ چودہ سو برس سے اس اُمت کے مفسرینِ کرام کی اس متفقہ اور مجمع علیہ تفسیر کے خلاف ہے جو وہ اصحابِ فیل کے واقعے کے بارے میں بیان فرماتے ہیں۔ اس صورت میں کیا ہم یہ مفروضہ قائم کر لیں کہ اُمتِ مسلمہ کی یہ جلیل القدر، وسیع العلم اور مایۂ صد افتخار شخصیات تو چودہ سو برس سے قرآن مجید کی ایک نہایت مختصر سورہ کے الفاظ کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہی ہیں۔ اور ہمارے زمانے کے جو متجددین اور منکرینِ حدیث پیدا ہوئے ہیں وہ اس اُمت کو واقعۂ اصحابِ فیل کی صحیح صحیح تفسیر بتا رہے ہیں؟ مگر ہم اس طرح کے مفروضوں پر نہیں جی سکتے۔ اُمت کے تمام علمائے اسلام کے خلاف ہم عدمِ اعتماد کی تحریک نہیں پیش کر سکتے۔ کیونکہ اس صورت میں ہم پورے دینِ اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ آج ہمارے پاس وہی قرآن مجید محفوظ اور موجود ہے جو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اُمت کے سپرد کیا تھا۔ پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور آپؐ کا اسوۂ حسنہ آج ہمارے درمیان من وعن

موجود ہو سکتا ہے ؟ اور جب ہمارے ہاتھ سے کتاب و سنّت دونوں نکل جائیں تو پھر ہمارے ہاتھ میں باقی کیا رہ جاتا ہے ؟ عقلِ سلیم یہی کہتی ہے کہ چودہ سو برس پر محیط ہزاروں اور لاکھوں اہلِ علم مفسرینِ کرام جن میں عرب و عجم کے علمائے اسلام شامل ہیں، ان لوگوں کی بہ نسبت بہت بہتر طور پر قرآن مجید کی تفسیر بیان کر سکتے ہیں جن کا سرمایۂ افتخار ہی مغرب زدگی کا احساس ہے اور جن کا ذہن مغرب سے مرعوب ہو کر اصولِ دین کو لسگاڑنے میں سرگرمِ عمل ہے۔

قریش پر بے حمیتی کا الزام

تجدد پسند حضرات کہتے ہیں کہ اگر سورۂ فیل کی روایتی تفسیر مان لی جائے تو اس سے ان کے ممدوح "قریش پر بے حمیتی کا الزام" عائد ہوتا ہے جو کہ اُن کے خیال میں ایک نامناسب بات ہے۔

سبحان اللہ! مشرک، بُت پرست اور کمزور قریش نے اگر ابرہہ کے لشکرِ جرّار اور ہاتھیوں کا مقابلہ نہیں کیا اور وہ اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ اس چیز کو اگر مفسرینِ کرام نے بطورِ واقعہ بیان کر دیا ہے تو اس سے متجددین کے نزدیک "غیور قریش" پر بے حمیتی کا الزام لگتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی مؤرخ یا صاحبِ تفسیر یہ تاریخی حقائق پیش کرے کہ بُت پرست قریش نے توحید کے مرکز خانہ کعبہ کے اندر ۳۶۰ بُت نصب کر کے خانۂ خدا کو بُت خانے میں تبدیل کر دیا تھا اور یہ کہ قریش کے لوگ اپنی بیٹیوں کو خود زندہ درگور کر دیا کرتے تھے تو کیا اس وقت ان تاریخی واقعات کے ذکر سے قریش پر بے حمیتی کا الزام نہیں لگتا۔

دراصل سورۂ فیل کا مرکزی مضمون اور موضوع اللہ تعالیٰ کو محض معاون و مددگار ثابت کرنا اور قریش کو ہیرو بنا کر پیش کرنا نہیں ہے جیسا کہ متجددین حضرات نے سمجھ رکھا ہے بلکہ اس سورہ کا موضوع اور مرکزی مضمون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ساری نوعِ انسانی کے سامنے یہ حقیقت کھول کر بیان کر دی ہے کہ فی الواقع وہی قادرِ مطلق ہے۔ وہ اپنی قدرتِ کاملہ سے جو چاہے کر سکتا ہے۔ سب کے سامنے اصحابِ فیل کا واقعہ ہوا تھا۔ اور یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی قدرتِ قاہرہ تھی جس نے خانہ کعبہ

کی حفاظت فرمائی کیوں کہ قریش کے لیے بیت اللہ کا دفاع ممکن نہ تھا ۔ اللہ تعالیٰ ہی نے اپنی ایک کمزور اور حقیر مخلوق پرندوں کے ذریعے ایک بڑے طاقت ور دشمن کو نیست و نابود کیا اور قریش کو بھی ہلاک و برباد ہونے سے بچا لیا ۔ شرک کے پجاری اور جھوٹے معبود سب بے بس تھے ۔ اور اس میں صرف اللہ کی قوت و قدرت تھی جس نے اپنے گھر کو اور اہلِ مکہ کو ایک عظیم خطرے سے محفوظ کر دیا ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ہی قادرِ مطلق ہے ، معبودِ حقیقی ہے ، اس کا کوئی شریک نہیں اور بندوں کو صرف اسی کی عبادت کرنی چاہیے ۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔